حیات اللہ انصاری

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے اس جلسہ میں تو میں موجود نہیں تھا جس میں حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنا وہ مضمون پڑھا تھا جس کی صورت انجمن کی تنقید سے زیادہ فردِ جرم کی سی تھی، لیکن اگلے جلسے میں ضرور شریک تھا، جس میں سکریٹری نے پچھلے جلسہ کی رپورٹ پیش کی تھی۔

حیات اللہ صاحب نے ترقی پسند ادیبوں کو سوچنے، سمجھنے اور حقیقتوں سے آنکھیں ملانے کی تلقین کی تھی، اور انجمن پر طرح طرح کے الزامات لگائے تھے۔ ظاہر ہے اس مضمون کا ردِ عمل بے حد سخت ہوا تھا اور ڈاکٹر علیم نے جن کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے "ہفت روزہ ہندستان" میں وہ بطور مدیر کام کر چکے تھے کہا تھا!

"حیات اللہ انصاری صاحب یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ صرف وہی دیکھتے، سمجھتے اور سوچتے ہیں۔ ہم کو بھی علم و ادب سے دلچسپی ہے، ہم لوگ بھی پڑھتے لکھتے رہتے ہیں اور حقیقتوں کو نہ صرف دیکھنے بلکہ ان کا مقابلہ کرنے کا یارا بھی رکھتے ہیں"۔

(یہ الفاظ میں نے اپنی یادداشت سے لکھے ہیں)

یہ واقعہ غالباً ۱۹۵۰ء کا ہے۔ اُن دنوں سرور صاحب کے بیرو روڈ کے مکان پر انجمن کی نشستوں میں ڈاکٹر علیم، احتشام حسین، شوکت صدیقی، مسیح الحسن رضوی، رضا انصاری، ڈاکٹر رشید جہاں، کمال احمد صدیقی، سلام مچھلی شہری، ایاز انصاری، اچل سنگھ، مجاز، منظر سلیم، حبیب صاحب، برج موہن ناتھ کاچر، محمد شکیل، مجید پرویز اور درجنوں دوسرے ادیب و شاعر، یونیورسٹی کے پروفیسر اور ادب اور ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ اُن میں سے جو سرکاری ملازمتوں میں تھے وہ رجسٹر پر دستخط نہیں کرتے تھے کیونکہ انجمن کو سیاسی تنظیم قرار دے دیا گیا تھا۔

اس وقت تک میں نے حیات اللہ صاحب کو نہیں دیکھا تھا اور اس پس منظر سے واقف نہیں تھا جس نے گاندھیائی نقطۂ نظر سے ان کے شغف کو ترقی پسندی کی مخالفت تک پہنچا دیا تھا اور وہ اُردو حلقوں میں ''انجمن'' دشمنی کی علامت بن گئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے نقطۂ نظر کی مخالفت اس وقت بعض ایسے لوگوں نے بھی کی تھی جو ابتدا سے اس کے ساتھ تھے لیکن حیات اللہ انصاری کی طرح ان لوگوں نے متشدد اور جارحانہ رخ اختیار نہیں کیا تھا۔

یادش بخیر وہ زمانہ خوابوں کا تھا۔ انقلاب کا خواب، زندگی کو بہتر بنانے کا خواب، عوام کی خوشحالی اور پُر مسرّت زندگی کا خواب، اور ان خوابوں کی راہ میں ''روڑے اٹکانے والے'' دشمن اور Villain بن گئے تھے۔ ایسے ہی ایک Villain حیات اللہ انصاری بھی تھے۔

کئی مہینے بعد ''پیپلس پبلشنگ ہاؤس'' کے سامنے سے حیات اللہ صاحب گذرے تو مسعود نے، جو ان دنوں اس ادارے کے منیجر تھے، مجھ سے کہا۔

''کیا یہ حضرت جھکنا نہیں جانتے؟

''اپنے آقاؤں کے سامنے تو ضرور جھکتے ہوں گے''۔

میرے لہجہ میں تلخی بھی تھی اور نفرت بھی، لیکن انجمن کے جلسوں کی تفصیلی رودادیں ''قومی آواز'' میں باقاعدگی سے شائع ہوتیں، اور ایک دن جب یہ احساس ہوا کہ ''قومی آواز''

میں ایسے بہت سے چہرے نظر آتے ہیں جو انجمن کے جلسوں میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ سرگرم ترقی پسند ہیں تو یک گونہ حیرت ہوئی۔ مسیح الحسن رضوی، حبیب صاحب، منظر سلیم، رضا انصاری، چند ایسے ہی چہرے تھے۔

کئی برس بعد بلکہ تقریباً چالیس سال بعد میں نے ایک دن حیات اللہ صاحب سے کہا ''آپ کی کمیونسٹ دشمنی دکھاوے (اصل لفظ Superficial تھا) کی ہے''۔

حیات اللہ صاحب میری اس جسارت پر جس قدر حیران تھے اس سے زیادہ میرے اس خیال پر۔

''کیا مطلب؟'' ان کے لہجہ میں ہلکی سی تلخی تھی۔

''آپ کمیونسٹ دشمن کی حیثیت سے مشہور یا بدنام ہیں۔ لیکن کیا یہ محض اتفاق ہے کہ آپ کو ''قومی آواز'' کے لیے کمیونسٹوں اور ان کے ہمنواؤں کے علاوہ کوئی ملتا ہی نہ تھا''۔

حیات اللہ صاحب میری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''عشرت صاحب سامراج دشمن، رضا انصاری صاحب ترقی پسند، محمد حسن قدوائی صاحب کمیونسٹ، مسیح صاحب کمیونسٹ، منظر سلیم، مکین احسن کلیم، حبیب صاحب کمیونسٹ اور میں ـ ـ ـ مجیب صاحب کمیونسٹ دوست اور قیصر تمکین اگرچہ ترقی پسندوں سے ناراض رہتے ہیں لیکن رجعت پسند بہر حال نہیں''۔

''میں نے اس نقطۂ نظر سے کبھی نہیں سوچا تھا'' حیات اللہ صاحب مسکرائے اور اپنے کمرے میں دیوار پر ٹنگی ہوئی پنڈت نہرو کی تصویر کی طرف دیکھنے لگے۔ گاندھی جی کی ایک چھوٹی سی تصویر دوسری دیوار پر آویزاں تھی۔

حیات اللہ صاحب کی شہرت کا ایک اہم پہلو اُن کی یہی کمیونسٹ دشمنی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک زمانہ میں وہ کمیونسٹ نہیں تو تقریباً کمیونسٹ ضرور تھے۔ کمیونسٹوں سے

اُن کی دوری کی ابتدا ایک تکلیف دہ سلسلۂ واقعات سے ہوئی، جس میں فرنگی محل کے نواح کے ایک مکان کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کہانی کے کردار تھے سردار جعفری، فرحت اللہ انصاری، مجاز، اور سبطِ حسن ایک جانب، اگرچہ سب ایک دوسرے کے رقیب، اور حیات اللہ صاحب دوسری جانب اور درمیان میں تھیں ایک خاتون جو "چارمنگ لیڈی[1]" کے نام سے مشہور تھیں۔

جلسے جلوسوں کی حد تک تو حیات اللہ صاحب انجمن ترقی پسند مصنّفین سے الگ ہو گئے لیکن دل و دماغ میں گاندھی واد اور کمیونزم کے درمیان کشمکش برسوں جاری رہی۔ حد یہ ہے کہ "قومی آواز" کے مدیر کے انتخاب کا وقت آیا تو رفیع احمد قدوائی صاحب نے ان کا نام مسترد کر دیا کیوں کہ ان کے خیال میں وہ متشدد کمیونسٹ تھے۔ حیات اللہ صاحب نے علیم صاحب سے جو "ہفت روزہ ہندستان" کے مینجنگ ڈائرکٹر رہ چکے تھے، مداخلت کرنے کی درخواست کی اور علیم صاحب نے قدوائی صاحب کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر آمادہ کر لیا۔

حیات اللہ انصاری صاحب اپنی غیر مطبوعہ خودنوشت میں لکھتے ہیں۔

> "علی گڑھ میں میرا رجحان کمیونزم کی طرف زیادہ ہو گیا تھا اور کبھی کبھی ایسا بھی لگتا تھا جیسے کہ میں نے اس کے حق میں فیصلہ کر لیا ہے، لیکن پھر نمک ستیہ گرہ کے وہ اثرات یاد آئے جو میں نے لوگوں کے دلوں پر محسوس کیے تھے، دل کہتا کہ یہ اثرات باطل نہیں ہو سکتے۔
>
> "اس کشمکش سے مجھے دو تجربوں نے نکالا۔ ایک تو گاندھی جی کی ستیہ گرہ نے، دوسرے میرے مزدوروں کی طاقت کے مطالعہ نے۔ آخر میں فیصلہ میں نے کیا ہے ۱۹۴۸ء میں یعنی لگ بھگ پندرہ سال کی کشمکش کے بعد"۔

---

[1] نام بدل دیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے فرحت اللہ انصاری صاحب سے معلوم ہوئی تھیں۔ فرحت صاحب نے ہی علی گڑھ میں سردار جعفری کو لفظ "بورژواژی" سے متعارف کرایا تھا۔

اس تحریر سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ''قومی آواز'' کے اجرا کے وقت حیات اللہ صاحب پر کمیونزم کے اثرات موجود تھے اور یہ اثرات اس قدر شدید تھے کہ ان سے چھٹکارا پانے میں انھیں لگ بھگ پندرہ سال لگ گئے اور وہ بھی کشمکش کے پندرہ سال۔

قدوائی صاحب نے جو کمیونسٹ پارٹی کے سخت خلاف تھے حیات اللہ صاحب کے دل و دماغ میں کمیونزم کی راکھ کو، جس کی گرمی بھی مائل بہ زوال تھی، متشدّد قسم کا کمیونزم سمجھ کر ایڈیٹر کے طور پر علی ظہیر مرحوم کے ایک عزیز کو پروانۂ تقرّری بھی جاری کر دیا تھا۔

حیات اللہ صاحب علیم صاحب سے بہت متاثر تھے اور اُنہوں نے مداخلت نہ کی ہوتی تو ''قومی آواز'' صحافت میں وہ مقام کبھی نہ حاصل کر پاتا جس نے اُسے اُردو کا پہلا جدید روزنامہ بنا دیا۔

میں یونیورسٹی میں پہنچا تو ایک دن میں نے عشرت صاحب سے، جو اُن دنوں بھی ''دُنیا کا حال'' نام کے اپنے کالم کے لیے ساری صحافی برادری میں مشہور تھے، کہا کہ اگر میں یونیورسٹی کی خبریں دیا کروں تو کیا آپ چھاپیں گے۔ عشرت صاحب حیات اللہ کے پاس گئے، ساری بات بتائی اور مجھے اسی وقت یونیورسٹی کا نامہ نگار بنا دیا گیا۔ اعزازی نامہ نگار کی حیثیت سے تقرّری کا خط میرے حوالے کرتے ہوئے حیات اللہ صاحب نے کہا ''آپ نامہ نگار اچھے بنیں گے، اس میں جاسوسی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔''

''لیکن میرے جاسوسی ناول تو فرضی ناموں سے چھپتے ہیں'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میں بھی چھوٹا موٹا جاسوس ہوں'' وہ مسکرائے۔ (یہ بات بہت دنوں بعد معلوم ہوئی کہ جاسوسی ناولوں سے حیات اللہ صاحب کو خاصی دلچسپی تھی)

یونیورسٹی کے طلبہ کی تحریک جس کی قیادت اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے کرشنا نند، رابن مترا، ابن حسن، انرد گپتا، خدیجہ انصاری اور سوشلسٹ پارٹی کے ترپاٹھی کر رہے تھے

زوروشور سے جاری تھی۔شہر کے بیشتر حصّوں میں کرفیو لگا ہوا تھا۔حیات اللہ صاحب کو میرے سیاسی خیالات، اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے میرے تعلق اور طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں میری سرگرمیوں کا علم تھا لیکن میری اسٹوری (اخباری اصطلاح میں خبر کو اسٹوری کہتے ہیں۔) روزانہ ''قومی آواز'' میں آن بان سے شائع ہوتی۔پھر چند دن بعد میں گرفتار کرلیا گیا۔میں نے قیصر باغ کوتوالی میں پریس پاس دکھایا تو ایک مجسٹریٹ نے جو گرفتاریوں کو قانونی شکل دینے کے لیے وہاں موجود تھے مجھے حوالات سے باہر کر دیا۔اتفاق سے اسی وقت تھانہ کے انچارج برگوتری، جو اُن دنوں ظاہر ہے بے حد مصروف تھے، آن پہنچے اور مجھے دیکھتے ہی بولے ''تم باہر کیسے آئے؟'' اور مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور مجسٹریٹ صاحب پولیس افسر کا مونھ دیکھتے ہی رہ گئے۔اُسی شام متعدد دوسرے طلبہ کے ساتھ مجھے بھی جیل بھیج دیا گیا۔

تین دن بعد یوپی اسمبلی میں تحریکِ التوا کے پیش ہوتے ہی مجھے رہا کر کے جیل کی گاڑی میں امین آباد لا کر چھوڑ دیا گیا تو میں سیدھا ''قومی آواز'' پہنچا، لیکن یہ یقین تھا کہ اب نامہ نگاری تو گئی۔

حیات اللہ صاحب نے مجھے دیکھا تو کہا۔''آج تو آپ اسمبلی کی اسٹوری میں آ گئے''۔

اگلے دن ''قومی آواز'' میں تحریکِ التوا، میری رہائی کی خبر اور طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں میری دی ہوئی خبریں ایک ساتھ شائع ہوئیں۔

دو سال بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں جب حبیب صاحب بطور مترجم تاشقند چلے گئے، میں ''قومی آواز'' سے باقاعدہ طور پر وابستہ ہو گیا۔لیکن اس باقاعدہ وابستگی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے جس سے حیات اللہ صاحب کی شخصیت کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

چھے مہینے تک بطور نوآموز (Apprentice) کام کرنے کے بعد جب میری تقرری یقینی ہو گئی تھی ایک اور صاحب، جنہیں قومی آواز، نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون کے ناشر ادارہ ایسوشی

ایڈیٹڈ جرنلس کے ایک ڈائرکٹر کی سرگرم حمایت حاصل تھی، بطور امیدوار میدان میں اتر آئے اور دفتر میں ایک طرح کا سرد ماحول پیدا ہوگیا۔ اب ایک جگہ کے لیے جس کی ماہانہ تنخواہ صرف ۸۰ روپے تھی، دو امیدوار تھے۔ چند دن بعد حیات اللہ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا۔

''اب دو امیدوار ہیں۔ آپ دونوں کا مقابلہ ہو جائے'' وہ مسکرائے۔

''میں کسی مقابلہ میں نہیں بیٹھوں گا'' میں نے کہا۔

''کیوں، کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟

''جی نہیں'' میں نے کہا''۔ میرے دوست ہیں، برسوں پرانی دوستی ہے اور دوسرے یہ کہ میری ایک چھوٹی موٹی ادبی حیثیت ہے (اللہ اللہ کیا کیا خوش فہمیاں تھیں اُن دنوں)۔ آپ کسی مصلحت یا دباؤ کے تحت میرے حریف اُمیدوار کو لینے پر مجبور ہو جا گئے تو بھی ظاہر یہی کریں گے کہ وہ بہتر اہلیت کا مالک تھا۔ میں اس کا موقعہ آپ کو دینا نہیں دینا چاہتا''۔

جملہ بے حد سخت تھا اور عمر کی اس منزل میں ہی ممکن تھا جب عشق آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ حیات اللہ صاحب میرا یہ جملہ سننے کے بعد اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر تقریباً نیم دراز ہو گئے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ کرسی کے اس چوڑے ہتھے پر تھا جس پر کاغذ رکھ کر وہ اداریہ لکھا کرتے تھے اور دوسرا پیشانی پر۔ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولے۔

''آپ کام کرتے رہیے۔ میں بعد میں بتاؤں گا!''

میں کمرے سے باہر چلا آیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ترجمہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی میز کی مشہور گھنٹی، جس کی آواز نیچے برآمدے تک سنائی دیتی تھی، بجی تو مدار بخش مرحوم جو اس وقت کچھ ایسے بوڑھے نہ تھے اپنا سر کمر سے خاصا آگے بڑھائے ہوئے حیات اللہ صاحب کے کمرے میں گئے اور تقریباً فوراً ہی واپس آئے اور میرے پاس آ کر سر کو ذرا سی جنبش دیتے ہوئے بولے ''بلاوت ہیں''

میں دھڑ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حیات اللہ صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

''آپ کی تقرری کر دی ہے''۔

غالباً ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کی ریاستی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی اور سارا شہر لالہ زار بن گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کمیونسٹ پارٹی کانگریس کی اصل حریف کے طور پر تیزی سے اُبھر رہی تھی۔ اتر پردیش کے مشرقی اضلاع اس کا گڑھ تھے، ریاستی اسمبلی کی چودہ پندرہ نشستوں پر اس کا قبضہ تھا اور اس سے زیادہ نشستیں اس نے بہت تھوڑے سے ووٹوں سے گنوادی تھیں۔ ہندی کے مشہور ادیب یشپال مرحوم جن کا اُردو کی جانب رویہ شکوک و شبہات سے کبھی بالاتر نہیں رہا مجلس استقبالیہ کے چیئرمین تھے۔ حیات اللہ صاحب نے کمیونسٹ پارٹی کو اُردو دشمن اور مسلمان دشمن ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک نہایت سخت اداریہ لکھا، بلکہ شائد تین اداریے لکھے۔ میں نے دفتر میں ہی بیٹھ کر اس کا اسی قدر سخت جواب لکھا اور شہر کی شاخ کے سکریٹری بابو خاں کو لے کر حیات اللہ صاحب کے کمرے میں گیا اور مراسلہ ان کو دیتے ہوئے کہا۔ ''بابو خاں صاحب نے یہ مراسلہ آپ کے اداریہ کے سلسلے میں لکھا ہے''

حیات اللہ صاحب نے، جنہیں شائد اس بات علم ہو چکا تھا کہ جواب میں نے لکھا ہے، کہا

''یہ تو آپ کی تحریر ہے۔''

''لیکن دستخط تو بابو خاں صاحب کے ہیں''

وہ مسکرائے اور مراسلہ کے صفحات اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔

''بھائی یہ بے حد طویل ہے''

''آپ کے اداریے کیا کم ....''میں نے کہا

''اچھا، اچھا دیکھوں گا۔'' اُنہوں نے کہا اور گفتگو ختم کر دی۔

اگلے دن یہ مراسلہ ''قومی آواز'' میں من وعن شائع ہوا۔

اُتر پردیش میں اُردو کی دستخطی مہم کی تکمیل کے بعد جب ۲۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ یادداشت صدر جمہوریہ کو پیش کی جانے والی تھی، ایک دن ''قومی آواز'' میں صفحہ اوّل پر ایک دو کالمہ خبر شائع ہوئی، سرخی تھی ''اُردو کا ہراول دستہ دہلی میں''۔ پوری خبر تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ حیات اللہ صاحب اور سلطانہ حیات صاحبہ غالباً محضر نامہ پیش کرنے کے سلسلے میں کسی کام سے دہلی گئے تھے اور انہوں نے اس دو۔رُکنی ٹیم کو ہراول دستہ کا نام دے دیا تھا۔ یہ خبر خود حیات اللہ صاحب نے لکھی تھی، دہلی کے لیے روانگی سے چند گھنٹے قبل۔ چند دنوں بعد علی گڑھ سے قاضی عبدالغفار اور ڈاکٹر علیم نے خاصے سخت الفاظ میں اس خبر کی تردید کی اور ان دونوں کو ہراول دستہ ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ تردید بھی ''قومی آواز'' کے پہلے صفحہ پر دو کالمہ سرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔

کمیونزم کی طرف حیات اللہ صاحب کے جھکاؤ کا ذکر آچکا ہے۔ ایک زمانے میں وہ خاصے پکّے کمیونسٹ تھے اور اپنے ان ہی خیالات کی وجہ سے انھیں فرنگی محل کی سکونت ترک کرنا پڑی تھی۔ ''ڈھائی سیر آٹا'' نام کا افسانہ جو ماہنامہ ''جامعہ'' میں شائع ہوا تھا اسی زمانہ کی یادگار ہے اور اسے پریم چند کے ''سوا سیر گیہوں'' پر زمانی تقدم حاصل ہے۔

ایک بات اور: چین کے حملے تک کمیونسٹ پارٹی کانگریس کی جگہ لینے کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کیرالا، بنگال، بہار، پنجاب اور مدارس میں حزب مخالف کمیونسٹ پارٹی ہی تھی۔ محض دس بارہ دن کی تیاری کے بعد کسی بھی ریاستی دارالسلطنت میں لاکھ دو لاکھ مظاہرین اکٹھا کر سکتی تھی۔ کیرالا میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کے بعد، جو دُنیا میں جمہوری طریقوں سے اقتدار حاصل کرنے والی پہلی ایسی حکومت تھی، شری نمبودری پد نے ایک پریس کانفرنس

میں کہا تھا ''اس بار تو ہم نے ایک دو کان کھولی ہے (کیرالا) اگلے انتخابات کے بعد ہم دوسری دو کانیں کھولیں گے'' اور بمبئ میں ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے شری پدامرت ڈانگے نے کہا تھا۔ ''سرخ سویرا اب زیادہ دور نہیں۔ معلوم نہیں کس صبح ہم سو کر اٹھیں تو معلوم ہو کہ ملک میں انقلاب آ چکا ہے''۔ چند سال بعد کیرالا حکومت کی برطرفی کے خلاف کمیونسٹ پارٹی نے دہلی میں جو مظاہرہ کیا تھا اس نے تو پنڈت گووند بلبھ پنت تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اور حیات اللہ انصاری صاحب کانگریس کے واحد اُردو اخبار کے ایڈیٹر تھے۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں ان کے ذاتی اختلافات، گاندھی جی سے شغف اور کانگریسی اخبار کی ایڈیٹری نے کمیونسٹ دشمنی کو ان کے لیے پوستین بنا دیا تھا۔

لیکن حیات اللہ صاحب اُردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے اور ان کی تخلیقات کو ان کے نظریات کا پیمانہ بنایا جائے تو ''لہو کے پھول'' سے قطع نظر (جو اِسی زمانہ میں لکھا گیا جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے) جس میں جگہ جگہ ان کے فن کو صحافتی رنگ سے زیادہ ان کے سیاسی افکار اور واقعات کی بالا دستی نے مجروح کیا ہے، ان کے افسانوں اور دوسرے ناولوں پر کمیونسٹ دشمنی کا نہ صرف یہ کہ سایہ تک نہیں بلکہ اِن میں سے بیشتر ترقی پسند فکر کے بہترین نمونے ہیں۔

حیات اللہ انصاری صاحب نے اُردو اخبار نویسی کو صحافت کے جدید رُجحانات سے روشناش کرایا، خبروں کو ادارتی پالیسی کی تابع بنانے سے احتراز کیا، خبر کی سرخی کو معروضی اندازِ نظر دیا، نت نئے تجربے کیے جن میں سے کچھ ناکام ثابت ہوئے اور کچھ کامیاب (خبر کو سرخی سے شروع کرنا ایک ناکام تجربہ تھا اور سرخی میں سے رائے کے عنصر کو خارج کرنا ایک کامیاب تجربہ) اور ''قومی آواز'' کو ایک زندہ اور متحرّک اخبار بنا دیا جسے اُن کے مخالفین بھی نظر انداز نہیں کر پاتے تھے۔

روزنامہ ''امروز'' نے اپنے ابتدائی شماروں کے بارے میں اربابِ قلم کی رائیں شائع

کی تھیں۔ منٹو نے لکھا تھا ''امروز'' دیکھ کر ایسا لگا جیسے ''قومی آواز'' پڑھ رہا ہوں۔ (الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں)

حیات اللہ صاحب ''قومی آواز'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کے سبکدوش ہوئے تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے جن سے اُن کی نوک جھونک چلا کرتی تھی، ''صدقِ جدید'' میں اُن کی صحافتی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے شذرہ کو اس مصرع پر ختم کیا تھا۔

لذّتِ غم نہ رہی یار کے اُٹھ جانے سے

حیات اللہ صاحب اپنی خودنوشت کا بڑا حصّہ لکھ چکے ہیں۔ وہ اسے مکمّل کر سکے اور انہوں نے اظہارِ حال میں اسی جرأت اور ہمّت کا مظاہرہ کیا جو وہ ''قومی آواز'' کے کالموں میں کیا کرتے تھے تو ان کی شخصیت کے بعض ایسے گوشے سامنے آئیں گے جو اَب تک نظروں سے اُوجھل ہیں۔

•

ایک ماہر پیراک، گھڑوں، مٹکوں اور آستینوں میں سانپ پالنے کے شوقین، ماؤنٹ ایوریسٹ سر کرنے کے لیے برسوں سرگرداں رہنے والے، بین الاقوامی فلم میلہ کے پہلے انعام کی مستحق قرار دی جانے والی فلم کے کہانی کار (کینس فلم میلہ، فلم نیچا نگر، کہانی حیات اللہ انصاری، پروڈیوسر چیتن آنند)، صفِ اوّل کے صحافی، ناول نگار اور افسانہ نویس اور اپنے خوابوں کو سرد منطق سے بکھیر دینے والے حیات اللہ انصای ایک مجموعۂ اضداد شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ خوبی ہر بڑے انسان میں ہوتی ہے۔

ان تضادات کو صرف اُن کی خودنوشت ہی حل کر سکتی ہے۔ ہمارے لیے اس کی اشاعت کا انتظار کرنے کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔

پس نوشت

آخر یہ شمع ۱۸ر فروری ۱۹۹۹ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ رہے نام اللہ کا۔

موت نے جوں ہی ان کے درِ دل پر آہستہ سے دستک دی، وہ آخری سفر پر کچھ اس

طرح چل پڑے جیسے مدّتوں سے اس کے انتظار میں تھے۔

مرحوم نے اپنی خودنوشت تقریباً مکمل کرلی تھی۔ اس کے کچھ حصے ان کی عنایت سے اس وقت دیکھ سکا تھا جب میں نے روزنامہ ''صحافت'' کا حیات اللہ انصاری نمبر ترتیب دیا تھا۔ اس میں ایک ایسے دور کی روداد بھی رقم ہے جب سیاست خدمت اور عبادت تھی۔ اس میں بہت کچھ ایسا ہے جو مسودہ ہی میں دفن رہ گیا تو یہ ایک بڑا المیہ ہوگا اور ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی کے بہت سے واقعات، افکار اور نظریات کی آمیزش اور آویزش اور کانگرس میں رجعت پسندی، ترقی پسندی اور درمیانی راہ کے حامیوں کی ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوششوں کی کہانی شاید معدوم ہوجائے گی۔

مزید: کل یعنی ۲۳ر دسمبر ۲۰۰۱ء کو پرانے خطوط اور کاغذات جو ۱۳ سال قبل نقلِ مکانی کے وقت ایک چادر میں باندھ دیے گئے تھے اور اسی طرح رکھے ہوئے تھے دیکھ رہا تھا۔ اس میں میرے نام حیات اللہ صاحب کے تین چار چند سطری خطوط کے علاوہ ایک مختصری خبر جو انہیں کی تحریر میں ہے، ملی۔ اس خبر کی شانِ نزول دلچسپ ہے۔ حیات اللہ صاحب اپنی بیگم سلطانہ حیات کے ساتھ دہلی سے آئے تھے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ صبح، پانچ ساڑھے پانچ یا چھے بجے کا وقت اور سڑکیں سنسان۔ موجودہ او۔ سی۔ آر بلڈنگ کے پاس چند غنڈوں نے جو چاقوؤں سے لیس تھے اُن کا سامان چھیننے کی کوشش کی۔ حیات اللہ صاحب رکشے سے کود پڑے اور اُنہوں نے چاروں غنڈوں کو مار بھگایا۔ اُن دنوں وہ نظر باغ میں رہتے تھے۔ یہ خبر اُسی واقعہ سے متعلق ہے۔ زندگی نے مہلت دی تو یہ مختصر خطوط اپنی خودنوشت ''جو یاد رہا'' میں جس کے تقریباً تین سو صفحات لکھے جاچکے ہیں، پیش کروں گا۔

■■